POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 17-18 June 2024, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 85 واں سال

Date of Publication: 16-06-2024 • Price: 5/- • 22-28 June 2024 • Issue: 24 • Vol:83

۲۲ تا ۲۸ رجون ۲۰۲۴ء • شمارہ: ۲۴ • جلد: ۸۳

تعلیم و تدریس کے چند مسائل

علی احمد فاطمی

بزرگوں سے کہتے سنا ہے کہ اردو صرف ایک زبان نہیں بلکہ تہذیب بھی ہے لیکن یہ تہذیب کیا ہے، اس کے اندرون کی پرتیں اور جہتیں کیا ہیں اور کس نوع کی ہیں اس کا تجزیہ کرنے چلیے تو ایک طرف تاریخ و تہذیب، معاشرت و ثقافت کی رنگارنگی دکھائی دے گی تو دوسری طرف زبان کی نیرنگیاں یعنی املا، تلفظ، صوت اور تذکیر و تانیث کے معاملات بھی سر اٹھاتے ہیں۔ ایک طرف اس کے بدن پر راجا مہاراجا، نوابین و سلاطین نے زیور پہنائے تو دوسری طرف اس کی روح کی پرورش صوفی سنتوں نے کی اور اسے تقدیس و تحریم کے لباس پہنائے۔ خواص نے اپنے جوہر دکھائے تو عوام نے اپنے طور پر اسے قبول کیا۔ بہرحال اگر ایک طرف زبان کے معاملات میں اردو داں حلقہ قدامت پرست واقع ہوا ہے اور صدیوں پرانے دہلی و لکھنؤ دبستانوں سے الگ نہیں ہو پایا ہے تو دوسری طرف آس پاس کی زبان خواہ وہ ہندی ہو یا پنجابی، بنگالی ہو یا مراٹھی، برج ہو یا ہریانوی؛ آج کی کنوینٹ زدہ مِلواں زبان ان سب کو گلے لگا کر آگے بڑھ رہی ہے۔ مشترکہ سماج کے عمل در عمل سے زبان کی جو نشو و نما ہوئی ہے اسے قبول کرنے میں بھی اردو کبھی پیچھے نہیں رہی۔ مسئلہ شمال اور دکن کا بھی رہا، لاہور اور حیدرآباد کا بھی، غرض کہ زبان اور تہذیب کے مسائل ہر دور میں رہے ہیں اور آج بھی ہیں بلکہ آج کچھ زیادہ ہیں اس لیے کہ عصرِ حاضر میں کسی بھی زبان کے نصاب اور تدریسی مزاج و انداز کے سامنے آج کا مشینی کلچر اور اس سے زیادہ صارفی کلچر زبان و ادب کی تمام پرانی نزاکتوں و حلاوتوں کو نگلنے کے لیے تیار ہے۔ ایسے میں زبان و ادب کی تفہیم و تعلیم کے نت نئے مسائل خاصے نازک اور پیچیدہ ہیں لیکن یہ مسائل صرف اردو کے ساتھ ہیں، کہہ نہیں سکتا کہ اس بازاری کلچر میں بہ حیثیتِ مجموعی زبان و ادب کے مسائل کھڑے ہوگئے ہیں۔ ان کی قدر و قیمت غیر معمولی طور پر پر متاثر ہوئی ہے۔

ایک معلّم و مدرّس کی حیثیت سے جب ہم نصاب کی تشکیل کرتے ہیں تو اس وقت ہمارے ذہن میں لسانی تاریخ کے ساتھ ساتھ زمانی اور انسانی تاریخ کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے نیز اُن تمام شعری و نثری اصناف کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے جس میں شعوری یا لاشعوری طور پر انسانی جذبات و احساسات، ان کے دکھ سکھ، تہذیب و معاشرت سبھی کچھ سمٹ آئے ہیں اس لیے کہ زبان محض زبان نہیں ہوتی بلکہ انسانی نفسیات اور حسّیات کے ساتھ ساتھ مذاق و مزاج کا موثر و بلیغ اشاریہ بھی ہوتی ہے۔ لاشعوری طور پر معاشرت و ثقافت کا تخلیقی اظہار بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آج بھی اپنے نصاب سے داستان، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ نہیں نکال سکے ہیں جو آج کے سائنسی دور میں ازکارِ رفتہ نظر آتی ہیں۔ آج کا طالبِ علم اگر سوال کرے اور کبھی کبھی کرتا بھی ہے کہ اس جدید ٹیکنالوجی کے دور میں ہم مافوق الفطرت کہانیاں اور داستانیں کیوں پڑھیں تو اس کا جواب اور قرأت کا جواز ہمارے پاس تو ہونا ہی چاہیے، لیکن عصری تعلیم اور اس کے بے رحم تقاضے نصاب کی سطح پر نہ سہی حساب کتاب کی سطح پر بہرحال کمزور سے کمزور تر کرتے چلے جاتے ہیں اور تدریس کی نزاکتیں ازخود متاثر ہوتی چلی جاتی ہیں، اس لیے کہ جب آج کا طالبِ علم جارحانہ طور پر سوال کرتا ہے کہ ہم اردو وہ بھی قدیم اردو کیوں پڑھیں، اس سے کیا فائدہ۔ ہمارے مستقبل کا کیا ہوگا۔ ہماری ملازمت کا کیا ہوگا؟ تو کارل مارکس یاد آنے لگتے ہیں جنھوں نے کہا تھا کہ تہذیب و ثقافت کا ارتقائی دار و مدار معاشیات و اقتصادیات سے وابستہ ہوتا ہے۔ انسان کی پہلی ضرورت اس کی معاشی ضرورت ہے۔ ہمارے قدیم اور استاد شاعر سوداؔ نے بھی سب سے پہلے فکرِ معاش کی بات کی تھی بعد میں عشقِ بتاں اور یادِ رفتگاں:

فکرِ معاش عشقِ بتاں یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کِیا کرے

انسان جب بھوکا ہوتا ہے تو 'کفن' کا گھیسو اور مادھو ہو جاتا ہے جہاں بُرے بھلے اور غلط و صحیح کی تمیز ختم ہو جاتی ہے اور انسان شراب نوش اور کفن فروش ہو جاتا ہے۔ یہ برہنہ حقیقت اپنی جگہ پر لیکن تہذیب و تعلیم اور تدریس کی بقا اور ارتقا اپنی جگہ پر۔ ہمیں اس کے تحفظ، تحمل اور ترقی کے بارے میں بہرحال فکرمند تو ہونا ہی چاہیے۔

ہماری ایک مشکل یہ بھی رہی، ماضی میں بھی اور شاید حال میں بھی کہ ہم یا تو مذہبی اداروں سے وابستہ رہے یا پھر عصری تعلیم سے وابستہ انگریزی، ہندی اداروں سے۔ درمیان کا راستہ ہمیشہ تنگ اور ویران سا رہا۔ یہ مسئلہ آج کا نہیں ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے جب انگریزی تعلیم کی طرف ضرورت سے زیادہ زور دیا تو اس سے الگ بلکہ بعض افراد تو اس سے منحرف ہو کر دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلما وغیرہ قائم کر گئے۔ عربی و مذہبی مدرسوں کی تو اپنی ایک الگ اور لمبی تاریخ تو ہے ہی، یہ علاحدگی، الگاؤپن کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ اس کا شکار ہیں ہمارے تعلیمی اداروں کے نصاب اور کتاب جو ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی اور عدمِ آہنگی کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اقبالؔ نے غلط نہیں کہا تھا:

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

ایک طرف اگر شعوری اور فکری عمل ہوتا ہے تو دوسری طرف غیر شعوری اور فطری عمل بھی ہوا کرتا ہے جس کے مدھم آثار آزادی کے بعد دکھائی دیتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی شہادت کے بعد نہرو و آزاد کی قیادت میں سماج کے مختلف شعبوں میں ترقی و تبدیلی کے آثار دکھائی تو دینے لگے لیکن مشرقی تہذیب کو نہ سمجھتے ہوئے یا سمجھتے ہوئے بھی مغرب کی تقلید میں ہم اوپری چمک دمک سے دوچار ہوئے لیکن اپنے ہی سماج کی گہرائیوں اور پیچیدگیوں کو سمجھے بغیر اس غیر فطری اور غیر منطقی عمل سے رفتہ رفتہ اس کی اہمیت و افادیت کم ہوتی گئی۔ ادھر نئے نئے علوم و فنون کی یلغار نے بھی ہمیں چکاچوند کر دیا۔ مشرق و مغرب، اندھیرے روشنی، ترقی و غیر ترقی کے اس گڈمڈ ماحول میں سب تیتر بٹیر ہو کر رہ گیا۔ زمینی حقیقت، علاقائی ثقافت اور ضرورت پسِ پشت چلی گئی۔

انجانے میں ایک مسئلہ اور پیدا ہو گیا۔ آزادی کے بعد سرکاری

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

اور نیم سرکاری سطح پر جو طریقۂ کار اختیار کیا گیا اس سے تعلیم و تدریس ازخود دو خانوں میں تقسیم ہوگئی۔ ابتدائی تعلیم میں تو عوام الناس کا خیال رکھا گیا لیکن اعلا تعلیم میں عوامی طبقہ یا متوسط طبقہ نظر انداز ہوتا گیا۔ تعلیم کو وحدت، صحت اور معیار بلند کرنے کے لیے جن مادی اور انسانی وسائل کی ضرورت تھی وہ تعلیمی توسیع کا ساتھ نہ دے سکے۔ تعلیمی معیار اور تعلیمی سہولتوں کے درمیان ربط ہونا ضروری ہوتا ہے ورنہ تدریس کے مسائل میں مزید پیچیدگی پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

ایک مسئلہ اور ہے کہ جدید دور میں تعلیم کو روزگار سے جوڑنے اور پیشہ وارانہ رُخ دینے کی مسلسل کوششیں جاری ہیں، یہ ایسی کوئی بُری بات نہیں ہے لیکن ضرورت سے زیادہ پیشہ ورانہ کلچر یا صارفی کلچر نے تعلیم کو بس پیشہ، روزگار اور فائدے نقصان سے جوڑ دیا ہے۔ تعلیم کے ساتھ جو تہذیب وتمدن کے رشتے ہوا کرتے تھے وہ ٹوٹنے لگے اور انسانی و اخلاقی علوم کے عناصر رخصت ہونے لگے۔ زبان وادب کی تعلیم و تدریس میں ایسے کاروباری معاملات اور پیشہ ورانہ سوچ ازحد نقصان دہ ہوا کرتے ہیں۔ یہ آج کی تعلیم و تدریس کا بڑا مسئلہ ہے۔ میں خود ایک مدرس ہوں، گذشتہ 35 برسوں سے اردو زبان وادب پڑھا رہا ہوں۔ جب کبھی کسی نوجوان کو اردو پڑھنے کی طرف متوجہ کرتا ہوں تو اس کا فوراً سوال ہوتا ہے: ''اس سے کیا فائدہ؟'' اب میں ان کو کیسے سمجھاؤں کہ دنیا میں ہر عمل، ہر فکر محض فائدے یا نقصان کے لیے نہیں ہوتی۔ اب اسی نوجوان سے سوال کیا جائے کہ تم اپنی ماں سے کیوں پیار کرتے ہو اس سے کیا فائدہ؟ بھائی بہن سے پیار کیوں کرتے ہو؟ انسان اپنی مادری زبان اور تہذیب سے کیوں پیار کرتا ہے۔ اب ان سے یہ کہیے کہ اردو تمھاری مادری زبان ہے تو وہ مادری زبان کا مفہوم بھی نہیں سمجھتے۔ اپنی تہذیب کی شناخت نہیں رکھتے۔ زبان وتہذیب بھی کیا ایسی اشیا ہیں جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ضرورت سے زیادہ مادیت روحانیت کو کس طرح قتل کر دیتی ہے اس کے نظارے آج ہر طرف دیکھنے کو مل جاتے ہیں کہ ہم کیا کھو بیٹھے ہیں اور مسلسل کھوتے جا رہے ہیں اس کا ہمیں احساس بھی نہیں رہ گیا ہے۔ ایسے میں علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آنے لگتا ہے:

واے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ایک مسئلہ اور ہے خاص طور پر شمالی ہند میں، مجھے نہیں معلوم کہ جنوب میں کیا صورت ہے۔ یوپی بہار میں اب اپر کلاس کے مسلمان اور ان کے بچے اردو نہیں پڑھتے۔ وہ اردو زبان سے تقریباً نابلد ہیں۔ نچلے متوسط طبقے سے جو بچے آتے ہیں اُن کی زبان، تلفظ اور ادائیگی بے حد خراب ہے۔ بقولِ پروفیسر سیّد محمد عقیل:

'اردو کی خوب صورتی الفاظ و اصوات کا وہ اجتماع جو اس زبان کی تشکیل میں شامل تھا وہ بکھر رہا ہے۔ ہندی کی آوازوں، اصوات اور گرد و پیش کے ہندی تلفظ کی فضا نے دھیرے دھیرے اردو کی نئی نسل سے شین قاف، اعراب، اصوات کی تمیز ختم کرنی شروع کر دی ہے۔ محاوروں کا صرف الفاظ کا محلِ استعمال، ترکیبوں کی بناوٹ سے ناواقفیت، غرض اردو کی تمام Fine Ties معرضِ خطر میں ہیں۔ ہم مدرّسوں کو اس کا اندازہ سب سے زیادہ اس لیے ہے کہ رات دن اردو کے طلبہ سے ہمارا سابقہ پڑتا رہتا ہے۔'

اب غور کیجیے اردو کی اعلا تعلیم و تدریس کی کیا صورت و معیار ہوگا۔ یوں بھی یونیورسٹی میں علوم وفنون کی فرسودہ باقیات کثرت سے پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اعلا تعلیم ایک مخصوص طبقے کے ہاتھوں سمٹ گیا ہے۔

اردو زبان وادب کی تعلیم و تدریس کے مسائل میں ایک پوشیدہ سچ یہ بھی ہے کہ وہ اب اقلیتی طبقے میں سمٹ کر رہ گئی ہے اور اقلیتی طبقہ بعض سماجی اور سیاسی جارحیت اور ناانصافی کی وجہ سے پس ماندہ اور خوف زدہ ہے۔ خوف زدگی اور پس ماندگی میں ایک انجان سا رشتہ ہوتا ہے جو بار بار سوال کھڑے کرتا ہے۔ کیا ہوگا پڑھ کے؟ اس ملک میں انھیں ملازمت تو ملے گی نہیں؟ چناں چہ بے نیازی، بے خبری اور پس ماندگی اپنی انتہا پر ہے۔ کہیں کہیں مدرسے تو ہیں جن سے اردو بچی ہوئی ہے لیکن وہ بھی اکثر مقامی و مسلکی جھگڑوں کے شکار رہتے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ایسا بڑا اور مرکزی ادارہ نہیں جو آج کی صورت کے پیشِ نظر اردو کو، اردو والوں کو جدید ترین صورتوں سے آشنا کرے۔

ان کے علاوہ ایک بڑا مسئلہ حکومت کی طرف سے بھی ہے۔ ایک تحقیقی مقالے میں، مَیں نے پڑھا:

'UGC کی ایک رپورٹ کے مطابق یونی ورسٹیوں اور کالجوں کی مجالسِ انتظامیہ میں سیاسی پارٹی بازی کا عمل دخل دیکھا گیا ہے۔ یہ چیز بھی سامنے آئی ہے کہ لائق طلبہ اور قابل اساتذہ پر یونیورسٹیوں اور کالجوں کے دروازے ذات پات، مذہب، زبان، سکونت، سیاسی نظریات اور اسی قسم کی دوسری وجوہات کی بنا پر بند ہوتے ہیں جن کا خود تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں۔'

اسی مقالے میں ایک اچھی بات یہ بھی لکھی گئی:

'اعلا تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے بین الاقوامی سمجھ بوجھ پیدا کی جائے۔ اعلا تعلیم یافتہ اشخاص ہی عام طور پر عوام کی رہنمائی کا کام انجام دیتے ہیں اور رائے عام کو متاثر کرتے ہیں، اس لیے تمام تعلیم کے نصاب میں دوسری اقوام کے کلچر کے اہم اجزا شامل کرنے چاہیے۔'
(شمالی ہند میں ثانوی سطح پر اردو زبان وادب کی تدریس کے مسائل، از تسنیم فاطمہ)

مجھے لگتا ہے کہ میں نے اس مختصر سے مقالے میں اشک شوئی کم اشک باری زیادہ کی ہے جس کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن علاج کے لیے مرض کا جاننا بہت ضروری ہے۔ ابھی تک ہم اندھیرے میں ہی تیر چلاتے آئے ہیں اور اکثر کو تو تیر چلانا بھی نہیں آتا، اسی لیے ہم پتھر پہ پتھر کھائے چلے جا رہے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ تعلیمی نظام یا تدریسی طریقۂ کار کو جدید سے جدید تر بناتے ہوئے اذہان، افکار صاف ستھرے اور غیر جانب دار ہونے چاہیے۔ آج کے دور میں جدید تعلیم اور طریقۂ کار کو اپنانے کی ضرورت تو ہے لیکن اپنی قدیم تہذیبی وکلاسکی روایات سے یکسر رشتہ توڑنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اساتذہ کو پوری ایمان داری کے ساتھ اپنے بچوں کی طرح طالبِ علموں کو پڑھانے کی ضرورت ہے۔ اکثر اساتذہ ہی بے خبر رہتے ہیں اور اپنی ملازمت کے ساتھ حق ادا نہیں کرتے۔ انھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ جدید دور میں آپ صرف اردو جان کر اردو نہیں پڑھا سکتے۔ آپ کو تھوڑی بہت انگریزی، ہندی، سائنس، سوشیولوجی وغیرہ کو بھی جاننا ہوگا۔ یہ تختی کا دور نہیں، یہ کمپیوٹر کا دور ہے اس لیے کمپیوٹر کا علم بھی بے حد ضروری ہے۔ نصاب اور درسی مواد پر مسلسل غور وخوض کرتے رہنے کی ضرورت ہے، اسے تبدیل کرنے اور حالاتِ حاضرہ سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ قدیم علوم ضرور رہیں لیکن جدید تر سے بھی واقفیت ناگزیر ہے۔ اپنے ملک کی تاریخ کے ساتھ ساتھ دنیا کی تاریخ اور حالات کو جاننا بھی ضروری ہے۔ آج دنیا کہاں ہے اور کس رُخ کو جا رہی ہے، یہ جاننا آج بے حد ضروری ہوگیا۔ اب ادب صرف شاعری تک محدود نہیں رہ سکتا۔ دنیا ہجر و وصال سے بہت آگے بڑھ چکی ہے، وہ اب Living together کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ اب اس میں جنسیات و ماحولیات، موسمیات، اطلاعات اور نہ جانے کتنے 'آت' اور واہیات شامل ہو چکے ہیں جس میں کچھ مثبت و صحت مند چیزوں کو شاملِ نصاب کرنا وقت کی ضرورت بن چکا ہے، لیکن ایک تلخ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بیشتر اساتذہ ان جدید علوم سے تقریباً ناواقف ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں جو ملک کی سرکاری زبان ہندی سے بھی واقف نہیں اور نہ جاننے پر فخر کرتے ہیں، اسی لیے وہ پریم چند کو صرف اردو کا تخلیق کار مانتے ہیں۔ ایسے اساتذہ یہ سوچنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے کہ ہماری اس کوتاہی سے طلبہ اور قوم کو نقصان پہنچتا ہے اور پہنچ رہا ہے۔ اردو میں آج بھی ڈراموں کا چلن عام نہیں ہوا کہ اس میں اداکاری ہوتی ہے اور بے پردگی بھی، اس لیے میڈیا کے اس دور میں بھی اسے مذہب وتہذیب کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

مہاتما گاندھی ازحد مذہبی وقدیمی اقدار وافکار پر یقین رکھتے تھے لیکن وہ یہ بھی کہتے تھے کہ کھڑکی کھلی رکھنی چاہیے تاکہ تازہ ہوائیں آسکیں اور ذہن معطر ہو سکے۔

آج اور اب اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اردو زبان وادب کا جو بھی نصاب تیار ہو، جو بھی معیار ہو اس میں جدید کاری اور مقابلہ جاتی اسپرٹ کا ہونا لازمی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ آج جو مقابلہ جاتی امتحانات ہو رہے ہیں ان میں اردو کے طلبہ کا انتخاب کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ کیا اس کی وجہ صرف تعصب اور ناانصافی ہے یا ہماری بعض کمزوریاں اور پچھڑاپن بھی شامل ہے۔

آج اخبارات میں، ٹی وی چینل میں اردو کے طلبہ کم سے کم دیکھے جا رہے ہیں جب کہ اردو کی قدردانی، شیریں بیانی، تلفظ کی روانی، ادائیگی اور پیش کش سب کے سب کل بھی پسند کیے جاتے تھے اور آج بھی ان کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ کل کی فلم انڈسٹری میں اردو دانوں، شاعروں اور مکالمہ نویسوں کی بھیڑ بھاڑ تھی۔ آج نہ کے برابر ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے اساتذہ نے، ہمارے نصاب بنانے والوں نے ان امور پر توجہ نہیں دی یا بہت کم دی۔ انھیں جدید انداز سے تیار ہی نہیں کیا گیا اور جو کام ہمیں نہیں کرنا چاہیے تھا وہ کرتے رہے۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ سماج میں استاد کو اسی لیے ایک رُتبہ دیا گیا ہے کہ وہ قوم ونسل کی تربیت کرتا ہے۔ اس کا ہر قدم قومی مفاد کے لیے اٹھتا ہے لیکن آج کے بیشتر اساتذہ ذاتی مفاد میں ڈوبے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایک بڑے نقصان سے دوچار ہیں، پس ماندگی کا شکار ہیں۔ ہم جدید دنیاوی علوم سے تقریباً بے خبر ہیں۔ ہم مادری زبان اور تہذیب کی اہمیت ومعنویت کو نہیں جانتے۔ ہم باہمی رگڑوں جھگڑوں میں پھنسے رہتے ہیں۔ ہم ہر ناکامی پر آسمان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں جب کہ یہ زمینی حقیقتیں ہیں انھیں اسی زمینی وانسانی جدوجہد اور سوجھ بوجھ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارے اساتذہ اور سارے اردو نصاب اچھے نہیں ہیں لیکن اکثریت کی حالت خستہ اور فرسودہ ضرور ہے۔ ہم نے بہت کچھ صرف اردو کے نصاب کو ہی نہیں بلکہ زندگی کے نصاب کو بھی نصیب پر چھوڑ دیا ہے جب کہ نصیب ترکیب سے بنتا ہے، مشق ومزاولت سے بنتا ہے۔ 'جب جاگو تبھی سویرا' پرانا محاورہ ہے لیکن ہے بہت بامعنی، اس لیے آج سے ہی عزمِ مصمّم کے ساتھ جدوجہد کی ضرورت ہے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی
B-518/1، کریلی، جی ٹی بی نگر، الٰہ آباد-211016 (یوپی)
Mob. No. 9415306239

تیسری اور آخری قسط

مغرب میں انشائیے کی روایت

محمد اسداللہ

ہنری تھوریو

Henry David Thoreau (1817-1862)

ہنری تھوریو امریکی انشائیہ نگار تھا۔اس کے انشائیوں پر اس کی زندگی کے گہرے نقوش نمایاں ہوئے۔اس کے افکار نے عالمی پیمانے پر لوگوں کو متوجہ کیا۔ مہاتما گاندھی اور مارٹن لوتھر کنگ بھی اس کے خیالات سے متاثر تھے۔ان کی سول نافرمانی کی تحریکات پر اس کا اثر نظر آتا ہے۔ایک مخصوص قسم و منفرد فکر اور طرزِ زندگی کے سبب اسے ایک مثالی ہیرو کی سی حیثیت حاصل تھی۔اس کے انشائیوں میں قدرتی مظاہر سے لطف اندوز ہونے اور انھیں نئی معنویت کے ساتھ پیش کرنے کا انداز نمایاں ہے۔وہ اپنے انشائیے 'رات اور چاندنی' میں لکھتا ہے:

'فرض کیجیے کہ آپ ان اشارات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو چاند ایک ماہ کے اندر کرتا ہے (ہر چند کہ اس کا یہ عمل بے نتیجہ ہی رہتا ہے) اور پھر بتائیے کہ کیا یہ ادب یا مذہب میں موجود مواد سے کوئی مختلف نوعیت کی شے ہے؟ لیکن کیوں نہ اس 'سنسکرت' کا مطالعہ کیا جائے؟ کیا فرق پڑتا ہے اگر چاند اپنی شاعری سے لبریز دنیا، اپنی پُراسرار تعلیمات، اپنے الہامی اشارات اور قیاسات کے ساتھ آیا ہے اور آکر چلا گیا ہے... چاند ایک ملکوتی ہستی ہے جو میرے لیے اشارات سے لدا ہوا آتا ہے اور ایک میں ہوں کہ جس نے اس سے کوئی فائدہ تک حاصل نہیں کیا؟ گویا چاند بغیر توجہ حاصل کیے رخصت ہو گیا ہے۔'[16]

آر. ایل. اسٹیونسن

Robert Louis Stevenson (1850-1894)

آر.ایل.اسٹیونسن کے انشائیے سادگی و پُرکاری کا ایسا نمونہ ہیں جن میں زبردست قسم کی ہنرمندی کا مظاہرہ ہوا ہے۔ یہ تحریریں بظاہر رسمی گفتگو کا انداز لیے ہوئے ہیں۔اس کے انشائیے، Apology for Idlers, Lantern Bearer, Walking Torch خیالات کے ایک بے ربط نظام، انشائیے کی ایک ڈھیلی ڈھالی بندش اور لطف اندوزی کی خوبیوں سے آراستہ ہیں۔

فطرت کے مظاہر میں ڈوب جانے کا رویّہ اسٹیونسن کی نثر کو شعریت سے قریب تر کر دیتا ہے۔اسٹیونسن کے انشائیوں میں الہامی کیفیت سے سرشار فقرے ملتے ہیں جن میں بندشِ الفاظ تہہ در تہہ معنویت کی حامل ہے۔آر.ایل.اسٹیونسن کے انشائیوں پر ہزلٹ کی گہری چھاپ ہے۔ وہ اسے اپنا استاد تسلیم کرتا ہے۔اسٹیونسن کے ہاں فطرت سے ہم آہنگ ہونے کا رجحان اور خود کلامی کا انداز نمایاں ہے۔ اس کے متعلق انور سدید لکھتے ہیں:

'اسٹیونسن کے مزاج میں ایک مخصوص قسم کی آوارگی موجود ہے اور وہ زندگی پر ایسے انسان کی نظر ڈالتا ہے جس کی مسرتیں اس کی دسترس میں ہیں۔ چناں چہ اس کے انشائیے Lantern LanternBearers, An Apology for Idlers, Walking Torch وغیرہ اسٹیونسن کے ایسے خواب ہیں جنھیں حقیقت سے ماورا نہیں سمجھا جا سکتا۔اس کے انشائیوں میں جذبے کی روانی اسلوب کے ساتھ ہم آہنگ ہے....'[17]

ایلفا آف دی پلو

Alfred George Gardiner (Alpha of the Plough) (1865-1946)

'ایلفا آف دی پلو' کے نام سے اے.جی گارڈنر نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران جو انشائیے تحریر کیے وہ ایک جداگانہ رنگ پیش کرتے ہیں۔ یہ تحریریں مہذب سوچ اور انشائیہ نگار کی شخصیت کا آزادانہ انعکاس ہونے کے علاوہ عصری زندگی کی دلچسپ تصویریں بھی پیش کرتی ہیں۔ Leaves in the wind, Pebbles on the shore اس کے انشائیوں کے مجموعے ہیں۔

اے.جی گارڈنر اپنے انشائیوں میں اسی طریقۂ کار کو اپناتے ہیں جو رابرٹ لنڈ نے اختیار کیا۔یعنی روزمرہ کی زندگی کے کسی معمولی سے واقعے کو لے کر اس کے گرد خیال آرائی کا ہیولا تیار کر کے موضوع کے متعلق اپنا ذاتی نقطۂ نظر پیش کرنا۔لوگوں کے رویّوں اور سماج کی ریت رواج سے قدرے منحرف ہو کر صورتِ حال کا از سرِ نو جائزہ لیتے ہوئے نئے افکار کی دریافت کا انداز اے.جی گارڈنر کے ہاں پایا جاتا ہے۔اے جی گارڈنر ایک مہذب، امن پسند اور انسانیت کی بہتری کے خواہاں شہری کی طرح اخلاقی قدروں اور اصلاحی صورتوں کی نشان دہی کرتے ہوئے ان اقدار کی پذیرائی یا مذموم حرکات کی مذمت کرتے ہیں لیکن اس طرح کہ انشائیے کی لطافت اور فنی لوازم کا پاس ان کی تحریر کو پند و نصائح کا روپ اختیار کرنے سے بچائے رکھتا ہے۔نرم گفتاری اور شگفتگی ان کے انشائیوں کا حسن ہے۔انشائیہ 'اظہارِ تشکر کرنا' میں لکھتے ہیں:

'دراصل خراب رویے زندگی میں زہر گھول دیتے ہیں، اور وہ سال بھر میں ہونے والے جرائم سے زیادہ مہلک ہوتے ہیں مگر کوئی قانون ہمارے رویوں، ہماری گفتگو، ہمارے غصے اور ہمارے مخصوص آداب پر قدغن نہیں لگا سکتا۔اب اگر ایک طرف ہم لفٹ مین کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں تو دوسری طرف ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہمیں کسی بھی خدمت کے عوض اظہارِ تشکر ضرور کرنا چاہیے۔آپ کا شکریہ، نوازش، مہربانی جناب، معاف کیجیے، معذرت خواہ ہوں چند ایسے الفاظ ہیں جن سے ہر شخص کے دل میں اچھے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور جو خدمت یا زحمت اس نے انجام دی ہے اس کا مداوا ہو جاتا ہے۔یہ وہ چکنا تیل ہے جس سے زندگی کی مشین اٹکے بغیر رواں رہتی ہے۔'[18]

اسی طرح دوبارہ زندہ ہونے کی عجیب و غریب خواہش پر اپنے خیالات کو اے.جی گارڈنر نے کچھ اس طرح لفظی جامہ پہنایا ہے:

'بارے دیگر دنیا میں آنے کا خیال نیا نہیں ہے۔ یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود حضرتِ انسان۔اور اس سوال کا جواب ہر دور میں ہمیشہ وہی دیا گیا ہے جو ہماری شام دوستاں میں دیا گیا۔حقیقت یہ ہے کہ جوانی کی دوپہر ڈھلنے لگتی ہے اور زندگی کا سونا صرف ہو جاتا ہے تو اس قسم کا سوال اچانک ذہن میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ جوانی کے تصورات تو سلسلہ در سلسلہ اور لامتناہی ہوتے ہیں، جوانی ہمارے سامنے نئے نئے خیالی مناظر، انوکھے اور اَن دیکھے خواب اور اُن کی خوش رنگ اور دلنواز تعبیریں پیش کرتی رہتی ہے۔

ہر لمحہ بدلتے عالم میں پرانی چیزوں کی طرف مڑ کر دیکھنے کی نہ تو فرصت ہوتی ہے اور نہ خواہش لیکن فرازِ کوہ پر پہنچ کر جب ہم دیکھتے ہیں کہ مناظر سے بھرپور وادی کو تو ہم نشیب میں چھوڑ آئے ہیں اور اب نظر کی دھند میں یہ منظر صاف دکھائی نہیں دیتا اور گرجا گھر کے اونچے کلس پر بھی شام کے سایے پھیلتے نظر آتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آفتابِ حیات بھی اب ڈھلنے والا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب دوبارہ زندہ ہونے کی خواہش سر ابھارتی ہے اور حیاتِ مکرر کا سوال دل سے ابھر کر ہونٹوں سے چپک جاتا ہے۔اس سوال کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی کا سفر بُرا کٹا بلکہ یہ سفر طویل تھا اور راستہ ناہموار اور اب جیسے ہم آبلہ پا ہو کر سفرِ حیات سے تھک چکے ہیں۔اس عالم میں آرام کا خیال کتنا شہد آگیں لگتا ہے اور پھر کس طرح فطرت لپک کر ہماری مدد کو آتی ہے، ہمیں پچکارتی ہے، سہلاتی ہے اور آرام بہم پہنچاتی ہے۔'[19]

ای۔ وی۔لوکس (1868-1938)

ای.وی.لوکس کے بیشتر انشائیے Punch میں شائع ہوئے۔ یہ سلسلہ اس نے تادمِ آخر برقرار رکھا۔ای.وی.لوکس کے انشائیوں میں چارلس لیمب کی طرح ایک حزنیہ لے لیمب کے شعوری اتباع کے نتیجے میں نمودار ہوئی۔ای.وی.لوکس سادہ، سلجھے ہوئے اور رواں دواں انداز میں متنوع موضوعات پر اپنے تاثرات رقم کرتا چلا جاتا ہے۔اس کے انشائیوں میں محبّت اور انسانی ہمدردی پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں مشاہدے کی گہرائی، شخصی تجربات کا بیان اور گپ شپ کی سی فضا لوکس کے انشائیوں کی خصوصیات ہیں۔لوکس کا انشائیہ اس کے لیے اپنی عمر رفتہ کو آواز دینے کا ایک وسیلہ ہے۔وہ اپنے خوابوں اور زندگی کی قدروں کو حزن و ملال کے ساتھ دیکھتا ہے اور اپنی زندگی کو ماضی کی گمشدہ کڑیوں کے مطابق استوار کرنا چاہتا ہے۔اس کے قارئین بھی اس کے ساتھ اس سفر میں ہم قدم ہوتے ہیں اور زندگی کی ایک نئی تعبیر سے آشنا ہوتے ہیں۔

I am a believer in Punctuality though it makes me lonely . The trouble with marriage is that, while every woman is at heart a mother , every man is at heart a bachelor.

ہلیئر بیلاک (1870-1953) Hilaire Beloc

ہلیئر بیلاک کے انشائیوں میں ہم کلامی کی کیفیت قارئین کو اپنی گرفت میں لیے رہتی ہے۔شگفتگی اور قولِ محال کے

...(بقیہ صفحہ 6 پر)

اردو دُنیا

بہار میں ایک لاکھ 87 ہزار اساتذہ کو تقرری نامہ سونپا جائے گا

پٹنہ (3 جون)۔ ریاستِ بہار کے سرکاری اسکولوں میں تقریباً پونے چار لاکھ کنٹریکٹ اساتذہ ہیں، ان میں سے اب تک ایک لاکھ 87 ہزار کنٹریکٹ اساتذہ اہلیتی امتحان پاس کر چکے ہیں۔ ان سبھی اساتذہ کو اب اسکول الاٹ کیا جانا ہے۔ محکمۂ تعلیم کی جانب سے کہا گیا ہے کہ اچھے نمبرات سے اہلیتی امتحان پاس کرنے والے کنٹریکٹ اساتذہ کو شہری حلقے کے اسکول الاٹ کیے جائیں گے۔ اس کے پیشِ نظر شہری اور دیہی حلقے کے اسکولوں کے خالی عہدے کی الگ الگ فہرست ترتیب دی جارہی ہے۔ ان اساتذہ کا اسکول الاٹمنٹ سافٹ ویئر سے ہونا ہے، اس کے لیے خالی عہدوں اور اساتذہ کی فہرست سافٹ ویئر میں اپ لوڈ کیا جارہا ہے۔ (انقلاب۔ دہلی)

انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ رانچی کی ضلعی کانفرنس منعقد، رانچی ضلع کمیٹی کا انتخاب

رانچی (2 جون)۔ انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ رانچی کی ضلعی کانفرنس زیر صدارت سیّد غفران اشرفی گلشن ہال، کربلا چوک، رانچی میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کو بہ حیثیت مہمانِ خصوصی مرکزی نمائندہ ایم. زیڈ. خاں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ 22 اضلاع میں دسمبر اور جنوری میں اس ہدایت کے ساتھ اڈہاک کمیٹیاں تشکیل دی گئی تھیں کہ تین ماہ کے اندر ممبر سازی کر کے انتخابی عمل مکمل کرلیا جائے گا۔ چار ضلعوں میں کانفرنس کرا کر انتخاب ہو چکا ہے۔ جون میں گریڈیہہ، ڈالٹن گنج، سمڈیگا، گملا، چترا، بوکارو، لاتیہار، جامتاڑا، گڈا، مدھوپور، دُمکا کا انتخاب کرایا جائے گا۔ ہم جھارکھنڈ میں انجمن کی مضبوط، جمہوری اور سیکولر تنظیم کھڑی کرنا چاہتے ہیں تاکہ اردو مسائل کو لے کر جھارکھنڈ میں تحریک قائم کی جاسکے۔ مرکزی نمائندے نے سرکار کے اس سرکلر پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مقامی زبان کے مجوزہ سروے میں اردو کا نام ہٹا دیا گیا ہے جو ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس سے قبل سرکلر میں اردو کو مقامی زبان کے زمرے میں رکھا گیا تھا۔ یہ اردو زبان کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ ہم اس کی سخت الفاظ میں مذمت کرتے ہیں اور سرکار سے مانگ کرتے ہیں کہ اردو سری مقامی زبانوں کی طرح اردو کو بھی مقامی زبان کی فہرست میں شامل کیا جائے تاکہ مجوزہ سروے کے توسط سے اردو کی صحیح صورتِ حال کا اندازہ لگایا جاسکے۔ آج بھی اردو کی بڑی آبادی اپنی مادری زبان اردو میں تعلیم حاصل کرتی ہے۔ ان کے بنیادی حقوق سے انھیں صریحاً محروم نہ کیا جائے۔ کانفرنس کی شروعات میں ہندی کے مشہور ادیب و شاعر چوتھی رام یادو، سرجیت پاتر، اردو کے ادیب وافسانہ نگار سلام بن رزاق اور شاعر پروفیسر راشد انور راشد کے انتقال پر انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ رانچی انجمن کے کنوینر شریف حسین مظہری نے اپنے تین ماہ کی کنوینر شپ میں کی گئی سرگرمیوں کی تفصیلی رپورٹ کانفرنس میں پیش کی جسے بحث کے بعد اتفاقِ رائے سے پاس کیا گیا۔ آمد وخرچ کی تفصیل بھی رکھی گئی۔ ہاؤس نے اسے بھی اپنی منظوری دی۔ رانچی ضلع کی کمیٹی کا انتخاب جمہوری طریقے سے کرایا گیا۔ انتخاب میں درجِ ذیل عہدیداران منتخب کیے گئے:

سرپرست: سیّد غفران اشرفی، شریف حسن مظہری
صدر: ڈاکٹر خالد سجاد
نائب صدر: حسیب اختر
ڈاکٹر اقبال احمد، ڈاکٹر نجمہ ناہید انصاری
سکریٹری: محمد شکیل
جوائنٹ سکریٹری: یاسمین لال
اسسٹنٹ سکریٹری: ڈاکٹر عالم آرا، ڈاکٹر محفوظ عالم، ڈاکٹر ریحانہ محمد علی
خزانچی: قیصر عالم
نائب خزانچی: شعیب عالم
مجلسِ عاملہ: اپراجیتا مشرا، نگار سلطانہ، محمد الیاس، آفتاب عالم، محمد حسن

کانفرنس کی نظامت کے فرائض ایم. زیڈ. خاں نے انجام دیے۔

◆◆◆

سخنِ افتخار
(کلیاتِ افتخار عارف)
افتخار عارف
قیمت: 1500 روپے

ماہرِ شبلیات ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی 'شبلی ایوارڈ' سے سرفراز

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی 'شبلی ایوارڈ' حاصل کرتے ہوئے
تصویر میں (دائیں سے بائیں) پروفیسر علاء الدین خاں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اور ڈاکٹر ظفر الاسلام دیکھے جاسکتے ہیں۔

اعظم گڑھ (24 جون)۔ عالمی شہرت یافتہ ادارہ دارالمصنّفین کے کانفرنس ہال میں منعقدہ ایک تقریب میں معروف اسکالر ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو شبلیات پر گراں قدر خدمات کے اعتراف میں پہلا 'شبلی ایوارڈ' تفویض کیا گیا۔ پروگرام کا آغاز حافظ قمر عباسی کی تلاوتِ قرآن مجید سے ہوا۔

اس موقع پر دارالمصنّفین کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں نے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو شال، توصیفی سند اور پچاس ہزار روپے نقد پر مشتمل ایوارڈ سے سرفراز کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ ہم نے ایسی شخصیت کی تکریم کی ہے جس نے علم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ انھوں نے علامہ شبلی پر جس قدر کتابیں لکھی ہیں اس سے زیادہ کسی بھی شخصیت پر نہیں لکھی۔ انھوں نے علامہ شبلی کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس پُرآشوب دور میں ایک بار پھر علامہ کے مشن پر کام کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ اس وقت ہمیں مستشرقین کے ساتھ جھوٹوں کا سامنا ہے، اس کا واحد حل علامہ کے مشن پر کام کرنے میں مضمر ہے۔

دارالمصنّفین کے سینئر رفیق مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی نے کہا کہ میں نے سیکڑوں جلسوں کی صدارت ونظامت کی ہے لیکن آج جس قدر مسرور ہوں کبھی نہیں تھا۔ ہمارے درمیان جو شخصیت موجود ہے وہ کبھی اسی شبلی اکیڈمی میں خوشخط سیکھنے آئے تھے، آج وہ بین الاقوامی شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے یہ مقام اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔ علامہ پر 36 کتابیں لکھنا شبلی سے ان کے عشق کی دلیل ہے۔

دارالمصنّفین کے رفیق کلیم صفات اصلاحی نے ڈاکٹر موصوف کا مفصل تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ دارالمصنّفین کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جب یہاں کسی اسکالر کو شبلی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اب تک چھوٹی بڑی کُل 62 کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں جن میں سے تین درجن کتابیں صرف علامہ شبلی پر لکھی گئی ہیں۔

شبلی ایوارڈ سے سرفراز ہونے کے بعد ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے جذباتی انداز میں اربابِ دارالمصنّفین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں اس لائق نہیں تھا، یہ میرے بزرگوں کی ذرہ نوازی ہے۔ انھوں نے کہا کہ علم وادب کے تعلق سے ہمارا ماضی غیر معمولی رہا ہے لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس وقت اس سمت میں کوئی جدوجہد نہیں ہورہی ہے، کبھی کبھی موجودہ صورتِ حال پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ یہاں سے وہ کام ہو جس کے لیے علامہ شبلی نعمانی نے اس ادارے کو قائم کیا تھا کیوں کہ موجودہ زمانے میں اس کی اہم ضرورت ہے۔ انھوں نے اکیڈمی کے تمام ذمے داران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایوارڈ کے ساتھ ملنے والی نقد رقم کو اکیڈمی کی نذر کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ طالبِ علمی کے دوران میں نے محسوس کیا کہ علامہ شبلی کی شخصیت ہمہ جہت ہونے کے باوجود بھی نصابوں میں انھیں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ حقدار تھے۔ چناں چہ میں نے شبلیات پر تحقیق اور الگ الگ جہتوں سے ان کو متعارف کرانے کے لیے جان کی بازی لگادی اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی نے ڈاکٹر موصوف کی زندگی کو نوجوانوں کے لیے نمونہ قرار دیتے ہوئے ان کو علامہ شبلی نعمانی کے تعلق سے مزید کام کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

اس موقع پر اراکینِ دارالمصنّفین کے علاوہ اعظم گڑھ پبلک اسکول کے منیجر محمد نعمان، ڈاکٹر ابو رافع، مرزا محفوظ بیگ، جاوید احمد، محمد ہشیم نعمانی اور غفران احمد سمیت معززینِ شہر بڑی تعداد میں موجود تھے۔

ریاستی اردو اکیڈمی کی زبوں حالی، 7 عہدوں کی ذمے داری ایک آفیسر پر

آر ٹی آئی رپورٹ کے مطابق 6 اسامیاں تقریباً 13 سال سے خالی ہیں

بجٹ کے نام پر دی جانے والی معمولی رقم سے ادبی، تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیاں متاثر

ممبئی۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی، ممبئی سے حاصل کردہ آر ٹی آئی رپورٹ کے مطابق اردو اکیڈمی کے لیے منظور شدہ سات عہدوں میں سے صرف ایک عہدے پر سرکاری افسر فائز ہے۔ باقی 6 اسامیاں تقریباً 13 سال سے خالی ہیں۔ حکومت کی جانب سے ان اسامیوں کو پُر کرنے کی کوئی پہل نہیں کی گئی ہے جس کی وجہ سے اردو اکیڈمی کا کام کاج بُری طرح متاثر ہے۔ اسی طرح اردو اکیڈمی کے بجٹ کا بھی سنگین مسئلہ ہے جس کی وجہ سے اکیڈمی کی ادبی، تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیاں برائے نام جاری ہیں۔ گذشتہ سال (2023-24) ایک کروڑ 31 لاکھ روپے کا بجٹ مختص تھا جس میں سے صرف 26 لاکھ 20 ہزار روپے ملے تھے۔ امسال اب تک صرف 21 لاکھ 12 ہزار روپے بطور بجٹ منظور کیا گیا ہے۔

غیر سرکاری تنظیم اردو کارواں کے صدر فرید احمد خاں نے 11 جون 2024 کو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی سے اکیڈمی کے موجودہ عملے کی تعداد، منظور شدہ عہدوں کی تعداد اور 24-2023 اور 2024-25 کے بجٹ کے تعلق سے آر ٹی آئی کے ذریعے معلومات طلب کی تھی جس کے جواب میں اردو اکیڈمی کے سپرنٹنڈنٹ ہاشمی سیّد شعیب نے 13 جون 2024 کو جو تحریری جواب دیا ہے اُس کے مطابق منظور شدہ عہدوں کی تعداد سات ہے جن میں سپرنٹنڈنٹ، اسسٹنٹ آفیسر، نائب مدیر، دو کلرک ٹائپسٹ، کلرک اور ایک خادم (سپاہی) شامل ہیں۔ ان میں سے صرف سپرنٹنڈنٹ اپنے عہدے پر فائز ہیں، باقی 6 اسامیاں خالی ہیں۔ اسسٹنٹ آفیسر (2023 سے)، ڈپٹی اڈیٹر (2013 سے)، کلرک ٹائپسٹ (2010 سے)، کلرک (2010 سے) اور سپاہی کا عہدہ 2020 سے خالی ہے۔ یہ ساری باتیں آر ٹی آئی کے ذریعے معلوم ہوئی ہیں۔

گذشتہ سال (2023-24) ایک کروڑ 31 لاکھ روپے کا بجٹ مختص تھا جس میں سے صرف 26 لاکھ 20 ہزار روپے ملے تھے جو اکیڈمی کی سرگرمیوں پر خرچ کیے گئے۔ امسال اب تک صرف 21 لاکھ 12 ہزار روپے بطورِ بجٹ منظور کیا گیا ہے۔

اس نمائندے کی حاصل کردہ معلومات کے مطابق ایک طرف اردو اکیڈمی کی سرگرمیاں عملے اور بجٹ کی کمی سے متاثر ہیں تو دوسری جانب ریاستی حکومت کے ذمے داران نے اکیڈمی کے سپرنٹنڈنٹ کو پنجابی اکیڈمی کی اضافی ذمے داری سونپ دی ہے جس کی وجہ سے اردو اکیڈمی کی کارگزاری مزید بُری طرح متاثر ہو رہی ہے، لیکن اس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے۔

راشٹریہ ای لائبریری کو چلانے کی ذمے داری نیشنل بک ٹرسٹ کو سونپی گئی

نئی دہلی (3 جون)۔ ڈاکٹر امبیڈکر انٹرنیشنل سنٹر میں ایک مفاہمت نامے پر دستخط کی تقریب منعقد کی گئی جس میں اسکولی تعلیم، محکمۂ خواندگی، وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند کی جانب سے راشٹریہ ای لائبریری کو چلانے کی ذمے داری نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کو سونپی گئی۔ تقریب میں اعلا تعلیم، حکومتِ ہند کے سکریٹری کے. سنجے مورتی، وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند کے جوائنٹ سکریٹری سنجے کمار، مسز ارچنا شرما اوستھی اور نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے ڈائرکٹر یوراج ملک موجود تھے۔ اس موقع پر سنجے کمار نے کہا کہ قارئین کے لیے کتابیں نیشنل ای لائبریری کے ذریعے کہیں بھی اور کسی بھی وقت دستیاب ہوں گی۔ یہ ان بچوں کے لیے بھی ایک اچھا پلیٹ فارم ہے جو مصنف بننا چاہتے ہیں۔ ہم نے لائبریریوں کو اپ گریڈ کیا ہے اور ملک بھر میں جامع تعلیم کو فروغ دینے کے لیے نئی لائبریریوں کے قیام کی بھی حوصلہ افزائی کی ہے۔ سنجے مورتی نے راشٹریہ ای لائبریری کو ملک کے بچوں اور نوجوانوں کے لیے ایک بڑا تحفہ قرار دیا۔ اس موقعے پر یوراج ملک نے کہا کہ راشٹریہ ای لائبریری ہندستانی علم کو عالمی سطح پر لے جانے میں مددگار ثابت ہوگی۔ اس میں اے آئی کا استعمال دیکھا جائے گا اور بچوں اور نوعمروں کے لیے مختلف قسم کی تخلیقی سرگرمیاں بھی منعقد کی جائیں گی۔ اس موقعے پر ہندستانی نوجوانوں میں پڑھنے کی عادت کو دوبارہ تیار کرنے کے موضوع پر ایک مباحثے کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اس بحث میں انڈین لنگویج کمیٹی کے چیئرمین چامو کرشنا شاستری نے کہا کہ نوجوانوں کو مادری زبان کے ساتھ دوسری زبانوں میں پڑھنے کی عادت پیدا کرنی چاہیے۔ سی بی ایس ای کے ڈائرکٹر ایس سی ایل ڈاکٹر بسواجیت ساہا بھی موجود تھے۔ انھوں نے طلبہ کے لیے نصابی سطح پر مختلف سرگرمیاں شامل کرنے کی سفارش کی اور کہا کہ نصاب اتنا دل چسپ ہونا چاہیے کہ پڑھنے کی عادت پیدا کرنے میں مددگار رہو۔

(انقلاب۔ دہلی)

اُردو گھر بودھن کو تیس لاکھ روپے میں فروخت کرنے کا الزام

تفصیلات فراہم کرنے سے تحصیلدار کا ٹال مٹول، رکنِ اسمبلی سدرشن ریڈی سے نمائندگی

بودھن، تلنگانہ (14 جون)۔ بودھن شہر کے وسط میں واقع ڈاکٹر علامہ اقبال اردو گھر کے حقیقی مالک کون؟ اردو اکیڈمی حیدرآباد یا اس عمارت کے حصے پر قابض سمینٹ و اسٹیل کی دکان کا مالک؟ موجودہ صدر نشیں بلدیہ بودھن کے شوہر شرت ریڈی کونسلر نے اسمبلی کے عام انتخابات کے دوران ایک عوامی جلسے سے مخاطب کرتے ہوئے بی آر ایس پارٹی کے بعض قائدین پر اردو گھر بودھن کی عمارت کو تیس لاکھ روپیوں میں فروخت کرنے کا مبینہ طور پر الزام عائد کیا تھا۔ شرت ریڈی کے عائد کردہ الزامات کی حقیقت جاننے کے لیے بودھن کے اردو صحافیوں نے اردو گھر کا دورہ کیا تھا جہاں اردو گھر کی عمارت کے سامنے لوہے کی سلاخیں اور ایک جانب کمرے میں سمینٹ برائے فروخت رکھی ہوئی پائی گئی اور اردو گھر کا سائن بورڈ غائب ہو چکا۔ اردو گھر کا مشاہدہ کرنے پر شرت ریڈی کے الزامات درست پائے جانے کا شبہ پیدا ہوا۔ حقیقتِ حال سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اردو صحافیوں نے کنوینر اردو گھر تحصیلدار بودھن گنگا دھر سے ربط پیدا کیا تو انھوں نے انتظامی کمیٹی کے چیئرمین کو طلب کیا لیکن وہ حاضر ہونے سے قاصر رہے۔ تحصیلدار بودھن نے صحافیوں کو پہلے اسمبلی کے اور بعد میں پارلیمانی انتخابات کا عذر پیش کیا۔ اردو گھر کمیٹی اور کنوینر تحصیلدار بودھن کی جانب سے اردو گھر کے انتظامی امور کی تفصیلات کی فراہمی میں ٹال مٹول کرنے پر تلنگانہ اردو جرنلسٹ فورم بودھن کا ایک وفد محمد خورشید حسین اختر کی قیادت میں رکنِ اسمبلی بودھن پی سدرشن ریڈی سے ملاقات کر کے موجودہ اردو گھر کی صورتِ حال سے انھیں واقف کروایا۔ ایم ایل اے بودھن نے بلا تاخیر کنوینر اردو گھر بودھن تحصیلدار گنگا دھر کو فون پر اردو گھر کی موجودہ صورتِ حال سے انھیں شام تک واقف کرنے کی ہدایت دی۔ تحصیلدار بودھن نے بلدی عہدیداروں کے ہمراہ اردو گھر کا دورہ کیا جہاں موجودہ اسٹیل و سمینٹ کی دُکان کے مالک نے سرکاری عہدیداروں سے عدمِ تعاون کیا جس کے باعث عہدیداروں کو واپس لوٹنا پڑا۔ تحصیلدار بودھن نے صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ وہ حسبِ قانون انتظامی کمیٹی کے چیئرمین کو نوٹس جاری کریں گے۔ اردو گھر بودھن کے تعلق سے ایم ایل اے سدرشن ریڈی سے نمائندگی کرنے والے وفد میں عبدالقدوس، رضوان، محمد وقارالدین، معراج رفیق، احمد وغیرہ موجود تھے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

ڈاکٹر محمود فیاض ہاشمی کے انتقال پر غالب انسٹی ٹیوٹ کا اظہارِ تعزیت

نئی دہلی (پریس ریلیز، 26 جون)۔ فارسی کے سینئر استاد اور سابق صدر شعبۂ فارسی ذاکر حسین کالج، دہلی، ڈاکٹر محمود فیاض ہاشمی کے انتقال پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر محمود فیاض ہاشمی ایک نیک دل انسان اور زبان و ادب کے سچے خدمت کرنے والوں میں تھے۔ انھوں نے ایک طویل مدت تک فارسی زبان و ادب کی تدریس کے فرائض انجام دیے اور ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد آج بھی زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ ان کے انتقال سے ادبی دنیا کا بڑا نقصان ہوا ہے۔ میں ان کی مغفرت اور پسماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہوں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ ڈاکٹر محمود فیاض ہاشمی صاحب کا طالب علمی کے زمانے سے غالب انسٹی ٹیوٹ سے تعلق تھا۔ وہ پروفیسر سید امیر حسن عابدی کے قریبی شاگردوں میں تھے اور ان کے ہمراہ برابر انسٹی ٹیوٹ آتے تھے۔ یہاں کے علمی کاموں میں اکثر ان کے مشورے شامل ہوتے تھے۔ ستمبر کے سمینار میں انھوں نے اپنا عالمانہ مقالہ بھی پیش کیا تھا۔ ان کی کمی ہمیشہ محسوس ہوگی۔ میں اپنی اور ادارے کی جانب سے ان کے پسماندگان اور وابستگان کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہوں اور ان کی بخشش کے لیے دعا گو ہوں۔

لفظ

(کلیاتِ زہرا نگاہ)

زہرا نگاہ

قیمت: 500 روپے

بقیہ: مغرب میں انشائیے کی روایت

(صفحہ 3 سے آگے)

ذریعے حقیقت کا دوسرا رخ نمایاں کرنے کا منفرد انداز اس کی تحریروں کو قابلِ مطالعہ بناتا ہے۔اپنے انشائیوں میں وہ مزاح اور سنجیدگی کے درمیان توازن برقرار رکھتا ہے۔ بقولِ انور سدید اس کی سنجیدگی کی دبیز سطح کے ساتھ شگفتگی ستاروں کی طرح ٹانکی ہوئی نظر آتی ہے۔چناں چہ جب بیلاک نکتہ آفرینی کرتا ہے تو مزاح نگار ہر گز نظر نہیں آتا۔ Hosts and Guests , Going out for a walk اس کے مشہور انشائیے ہیں:

'I have wandered all my life,and I have also traveled ; the difference between the two being this,that we wander for distraction,but we travel for fulfilment.

جی کے چسٹرٹن

(1874-1936) G. K. Chesterton

ذاتی انشائیہ لکھنے والوں میں جی کے چسٹرٹن کا انداز نرالا ہے۔وہ سلجھے ہوئے انداز میں گہرے اور بصیرت افروز نکات پیش کرتے ہیں جوان کے تجربات اور تخیلات کا منتھن ہیں۔ان کی پسند و ناپسند سے ان کی شخصیت کی پرتیں کھلتی جاتی ہیں۔چسٹرٹن کی تحریر میں زندگی کی حقیقتیں اس ترتیب سے بیان کی جاتی ہیں کہ بین السطور میں،نئی نئی سچائیوں کا احساس پڑھنے والے کو حزن و ملال سے دوچار کر دیتا ہے۔چسٹرٹن کے مشہور انشائیے 'نوجوان رہنے کی خواہش' میں مصنف نے کچھ پا لینے میں کچھ کھو دینے کے احساس کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس انشائیے کا ایک اقتباس (ترجمہ) درج ذیل ہے:

'جب ہم جوان تھے تو ضرب المثل مردہ تھی،اب کہ ہم موت کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں تو ایک جیتا جاگتا حکیمانہ قول بن گئی ہے۔گویا جب ہم مر رہے ہوتے ہیں تو ساری دنیا از سرِ نو زندہ ہو رہی ہوتی ہے...،تعلیم یافتہ لوگ جانتے تھے کہ مرے ہوئے دوبارہ اس جہانِ رنگ و بو میں نہیں آتے لیکن وہ جو پرانے وقتوں کو یاد کرتے ہیں اور جنھوں نے سر اولیور لاج ایسے سائنس کے مردِ میدان کو ایک مقبولِ عام مذہب کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے دیکھا ہے وہ جب کسی نوجوان کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ دنیا مافوق الفطرت عناصر سے نجات حاصل کر رہی ہے تو محظوظ ہوتے ہیں، کیوں کہ انھیں معلوم ہے کہ اس دنیا نے حقیقتاً کس سمت میں پیش قدمی کی ہے۔

میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ بوڑھے حضرات بالآخر دانا ہو جاتے ہیں کیوں کہ آدمی کو عقل مشکل ہی سے آتی ہے، اس لیے بھی کہ بیشتر بوڑھے حضرات ایک نہایت پُرکشش طفولیت اور ایک پُرمسرت معصومیت کو قائم و دائم رکھتے ہیں۔ بوڑھے لوگ اکثر و بیشتر نسبتاً کم عمر حضرات سے کہیں زیادہ رومینٹک ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو نسبتاً زیادہ مہم جو بھی اور پھر انھیں اس بات کو تسلیم کرنے میں بھی قطعاً کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کتنی ڈھیر ساری چیزوں کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔

لہٰذا اس ضرب المثل میں رتی بھر کھوٹ شامل نہیں کہ ایک بوڑھے احمق سے بڑھ کر کوئی احمق نہیں ہے۔شاید کہیں بھی کسی ایسے بیوقوف کا وجود نہیں ہے جو اپنی نجی احمقوں کی جنت میں آدھی خوشی سے بھی رہ رہا ہو۔ بااین ہمہ یہ بالکل بجا ہے کہ پختہ سالی کی تعریف میں جن دلائل کی عام طور پر تشہیر کی جاتی ہے فی الحقیقت وہ ایسے نہیں ہیں جیسے کہ بظاہر سچائی پر مبنی نظر آتے ہیں اور بالفرض اگر انھیں واقعی آشکار کر بھی دیا جائے تو یہ ہمیں بالکل ایک مضحک تضاد کی مانند معلوم ہوں گے۔'[20]

میکس بیر بوم Max Beerbohm (1872-1995)

میکس بیر بوم کے انشائیے اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں کہ اس سے پہلے کے انشائیہ نگاروں کے ہاں انکشافِ ذات سے پہلوتہی کی جانے لگی تھی اور انشائیے میں اس رنگ کی تحریروں کے بجائے اس طرزِ تحریر کو فروغ حاصل ہونے لگا تھا جو Personal Essay کا خاص انداز نہیں ہے۔میکس بیر بوم نے انشائیے کو اپنی ذات کی بے نقابی کا وسیلہ بنایا۔اس نے اپنی نگارشات میں مثبت قدروں کو اپنی شخصیت کے حوالے سے پیش کیا۔اس طرح وہ لیمب اور ہزلٹ کے فنِ انشائیہ نگاری سے قریب تر نظر آتا ہے۔

اپنے انشائیے 'الوداع کہنا' میں وہ کسی کو رخصت کرتے وقت پیش آنے والی دقت کو بیان کرتے ہوئے ہمیں اس وقت حیران کر دیتا ہے جب یہ بتاتا ہے کہ اس کام کو انجام دینے کے لیے باقاعدہ باہر کے لوگوں کی خدمات بھی حاصل کی جاتی ہیں۔

وہ لکھتا ہے: 'میں الوداع کہنے پر مامور ہوں یعنی بیورو کی طرف سے امریکیوں کو خدا حافظ کہنے کا فریضہ انجام دیتا ہوں تاکہ وہ رنجیدہ نہ ہوں کہ ان کو کوئی بھی الوداع کہنے والا نہیں... برادر آپ سمجھ گئے نا کہ میں سیئر آف seer-off ہوں۔'

میں نے کہا: ''لیکن ہماری آنکھوں میں جو آنسو تھے وہ حقیقی تھے مگر تم تو مصنوعی جذبات رکھتے ہو۔تمہاری آنکھوں میں جو آنسو تھے وہ؟''

اس نے جواب دیا: ''میں بھی اداکاری نہیں کرتا۔الوداع کہتے وقت جذبات موجزن ہوتے ہیں اور میں آبدیدہ ہو جاتا ہوں۔مگر تم ایک غیر شخص کے لیے رونے کی اداکاری نہیں کر سکتے... بالکل نہیں کر سکتے۔''

میں نے چیختے ہوئے گزارش کی: 'خدا کے لیے یہ اداکاری مجھے بھی سکھا دو۔'[21]

رابرٹ لنڈ Robert Wilson Lynd (1879-1949)

انشائیے کے موضوعات کو ذات کے حوالے سے پیش کرنے والے مغربی انشائیہ نگاروں میں رابرٹ لنڈ کا نام خصوصی توجہ کا حامل ہے۔اس نے انکشافِ ذات اور ندرتِ خیال کو درجۂ کمال تک پہنچا کر پرسنل ایسّے کے مخصوص رنگ کی نمائندہ تحریریں پیش کیں۔اپنے انشائیے میں کسی چھوٹے سے واقعے یا رویّے سے پھوٹتی ہوئی خیال کی چنگاری کو ہوا دے کر رابرٹ لنڈ موضوع کا پورا دائرہ روشن کر دیتا ہے۔اس کے انشائیے بنیادی معتقدات یا موضوع کے ساتھ وابستہ عمومی تصورات سے انحراف کے ذریعے شروع ہوتے ہیں اور خیالات کے مثبت یا منفی پہلوؤں کی چھان بین سے نئے مفاہیم برآمد کرتے ہیں۔رابرٹ لنڈ کے انشائیے 'کچھ عادت کے بارے میں' کا اقتباس درج ذیل ہے:

'میں اپنے بارے میں ہمیشہ یہ سوچتا تھا کہ میں چند عادات پر مشتمل ایک مخلوق ہوں جن میں سے بیشتر خراب ہیں لیکن آج مجھ پر عیاں ہوا کہ میں نئے پیکٹ کا پہلا سگریٹ نکالنے کے اس معمولی سے کام میں بھی عادات کا غلام بن کر رہ گیا ہوں۔ ویسے میں اصولی طور پر عادات کا دشمن نہیں ہوں۔ میری رائے میں آج تک کسی نے اتنی فضول بات نہیں کہی جتنا کہ پیٹر کا مشاہدہ ہے، پیٹر کا کہنا ہے، عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری ناکامی اس وجہ سے ہے کہ ہم عادات کو اپنا نہیں سکے۔اس بات میں آدھی سچّائی کے جراثیم تو موجود ہو سکتے ہیں لیکن کوئی بھی آدمی جو بد قسمتی سے عادات کو اپنانے کے قابل نہ ہو، وہ اس کہاوت کو ظاہری طور پر تسلیم کر لے گا۔'[22]

رابرٹ لنڈ نے بسوں کے متعلق اپنے منفرد خیالات اس طرح پیش کیے ہیں:

'اگر نسلِ انسانی جسمانی تحرک کی لذت ترک کرنے میں بطورِ ازالہ ذہن یا روح کے تحرک کی نئی لذتوں کی تحصیل کر رہی ہوتی تو موٹروں، بسوں کے حق میں مزید موشگافی ممکن تھی لیکن ذرا دنیا کے نقشے پر ایک نظر ڈالیے۔آپ اس میں کسی ایک گاؤں کی بھی نشان دہی نہیں کر سکیں گے کہ جس میں ذہنی یا روحانی نوع کی کسی دیسی ہلچل کا شائبہ بھی موجود ہو مثلاً وہ ہلچل جس نے لندن سے گزرنے اور انسان کا کچومر بنانے والی پہلی بس سے چار سو برس قبل سارے اٹلی کو سندرتا سے لبریز کر دیا تھا۔

ایسی صورتِ حال میں میری تمنا ہے کہ نئی چاکلیٹ بس ہر اعتبار سے کامیاب ہو۔میں اسے ضرور استعمال میں لاؤں گا لیکن میں ان تمام پا پیادہ آوارہ خرامیوں کو حسرت سے یاد کرتے ہوئے ایسا کروں گا کہ جب میں تر و تازہ ہرے بھرے گول مٹول پھلوں والے سادہ درختوں، کتب فروشوں، صرافوں، پھل فروشوں، تمباکو فروشوں کی دکانوں اور ان کے پر از افتخار اور قدیم سائن بورڈوں کے پاس سے بااطمینان گزر جاتا تھا، مگر جس سے میں اب محروم کر دیا گیا ہوں۔'[23]

ورجینیا وولف Virginia Woolf (1882-1941)

ورجینیا وولف زندگی کے حقائق کو ڈرامائی انداز میں بے نقاب کرتی ہے۔اس کے انشائیوں میں عالمانہ بصیرت اور خود کلامی کی کیفیت سے ایک مخصوص قسم کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے جہاں اس کی فکر اور محسوسات کا حاصل کوئی پیغام اشاروں میں موجود ہوتا ہے۔اس کا مشہور انشائیہ The Death of the Moth کہانی کے فارم میں ہونے کے باوجود کہانی نہیں بن پاتا، اس کی فکری جہت اسے ایک انشائیے کی حیثیت سے نمایاں کرتی ہے۔اس انشائیہ میں ایک خاص موسم میں پیدا ہونے والے پتنگے کی حرکات و سکنات کو بیان کیا گیا ہے جو جینے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا ہے مگر قدرت کے قانون کے آگے سرنگوں ہو جاتا ہے۔شیشے کی شفاف سطح کو پار کرنے کے لیے وہ پتنگا اپنی پوری توانائی جھونک دیتا ہے۔اس انشائیہ کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے:

'میں نے جب مرے ہوئے پتنگے کو دیکھا تو ایک عجیب سی حیرت نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔موت کی عظیم قوت نے کتنی حقیر سی مخلوق کو اپنا حریف سمجھ لیا تھا؟ اسے اپنے پنجۂ آز میں دبوچ کر کیا موت فتح یاب ہو گئی تھی؟ کیا اس کی یہ یلغار بہت بڑی کامیابی سے ہم کنار ہو چکی تھی؟ چند لمحے پہلے زندگی میرے لیے ایک پُراسرار قوت تھی لیکن اب موت مجھے اب ایک اجنبی طاقت نظر آنے لگی۔

پتنگا میرے سامنے سکون اور شائستگی کے ساتھ زمین پر پڑا تھا۔اس کے ہونٹوں پر ایک بھی حرفِ شکایت نہیں تھا، اس کی آنکھیں مُندی ہوئی تھیں لیکن اس کا جسم شانت تھا۔شاید وہ کہہ رہا تھا کہ: 'میں قوی ہوں لیکن موت مجھ سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔'[24]

صنفِ انشائیہ میں وقت کے ساتھ اپنے آپ کو ڈھالنے کی صلاحیت اور اس میں بروئے کار لائی جانے والی تخلیقی توانائی پر ورجینیا وولف کا پورا بھروسہ تھا۔ ورجینیا وولف کے عہد میں جب انشائیہ ایک آزمائشی دور سے گزر رہا تھا اور انشائیے کی موت کا اعلان کر دیا گیا تھا، مگر

وہ بڑا سخت جان ثابت ہوا اور دوبارہ ادب میں اپنے مقام کو بحال کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اسی دوران ورجینیا وولف کا یہ بیان سامنے آیا تھا:

'انشائیہ زندہ ہے اور مایوس ہونے کا کوئی محل نہیں۔ حالات کے تغیر کے ساتھ انشائیہ میں بھی رائے عامہ کے مزاج کے مطابق تبدیلیاں واقع ہوجاتی ہیں اور اچھا انشائیہ تغیر کے عمل کو بہتر بناتا ہے۔ اور اگر انشائیہ اچھا نہیں ہے تو یہ عمل بدترین ثابت ہوگا۔' [۲۵]

حاصلِ مطالعہ

انگریزی ایسّے نے صدیوں کے سفر میں مختلف ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ اس کی کائنات میں کئی تبدیلیاں واقع ہوئیں، جداگانہ صلاحیتوں اور رجحانات کے حامل ادیبوں نے اسے نت نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کیا۔ متنوع اسالیب، طرز ہائے فکر، رجحانات، زبان اور اندازِ پیش کش کے اعتبار سے انشائیہ کو بوقلمونی عطا کی۔

مانتین نے اس صنف کو جن مقاصد کے تحت باقاعدہ ایجاد کیا ان میں بنیادی چیز اظہارِ ذات تھی جو آج بھی اس کی انفرادی شناخت قرار دی جاتی ہے۔ انگریزی میں بیکن نے اس کے بنیادی مزاج سے قدرے انحراف کرکے دل کے بجائے دماغ کی نمائندگی کا آلۂ کار بنایا اور اسے ایک حکیمِ نکتہ رس اور فلسفی کا منصب عطا کرکے زندگی اور کائنات کی گہرائی میں غواصی کا خوگر بنایا۔

ابراہم کاولے تک درمیانی وقفے میں انشائیہ معاشرے کی تصویریں دکھاتا رہا۔ ابراہم کاولے نے انشائیے کو پھر وہ مقام عطا کیا جہاں نثر اور شاعری، حقیقت اور واہمہ، فکر اور جذبہ نیز انشائیہ اور زندگی باہم مربوط ہوکر تخلیقی ادب کا نیا انداز پیش کرتے ہیں۔

ولیم ہزلٹ نے انگریزوں کی طبعی خصوصیات کے تحت بھیڑ میں تنہائی سے آشنا فرد کے وجدان کو انشائیہ کا مزاج بنایا۔ چارلس لیمب اپنے لیے انگریزی انشائیہ نگاروں میں سب سے مختلف اور بلند مقام پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔ نشاط انگیزی اور المناکی کے اتصال پر فکر کا انعکاس کرکے اپنی ذات کے نہاں خانوں کی سیر کرواتا رہا۔

لیمب کی آواز، اس کا سوز وگداز اور فکری آہنگ اپنی انفرادیت منوانے میں کامیاب ہوا۔ لیمب کے انشائیے میں انشائیہ نگار کی ذات کی شمولیت دراصل بیکن کے بعد انگریزی انشائیے کے اس نئے موڑ سے آگے بڑھنے والے راستے کی توسیع ہے جسے ابراہم کاولے نے ماتین کی وراثت کے طور پر انگریزی انشائیے میں راسخ کیا۔

ایڈیسن اور اسٹیل اپنی شگفتہ اور فکر انگیز تحریروں میں تہذیبی قدروں اور قومی روایات کی بازیافت کے علاوہ یورپ اور انگلینڈ کی تصویر کشی اور کرداروں کے ذریعے اپنے عہد کی دکھتی رگیں ٹٹولتے رہے۔ اسی لیے ان کے انشائیے ان کی دل کی دھڑکنوں کے امین نہ بن پائے۔ اس جگ بیتی میں آپ بیتی کا حصہ کم ہی رہا اس کے باوجود انشائیہ کا مزاج ان کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر ایڈیسن کی تحریریں انشائیہ کا بہتر نمونہ ہیں۔

ایلفا آف دی پلو، آر ایل اسٹیونسن اور گولڈ اسمتھ کے انشائیے حقائق کی بازیافت اور زندگی کو ایک حساس، باخبر اور غور وفکر کے عادی شخص کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

میکس بیر بوم، آلڈس ہکس لے، ڈی کوئینسی اور پرسٹلے زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں سے زندگی کی ایک ایسی تصویر مرتب کرتے ہیں جس میں ان کے تخیلات، توقعات، خواہشات اور ذاتی رجحانات کا بھرپور عکس موجود ہوتا ہے۔

ورجنیا وولف جس نے شعور کی رو کی تکنیک کو اپنے ناولوں میں بحسن وخوبی برتا۔ اپنے انشائیوں میں وقت کو ایک نقطے پر سمیٹ کر زندگی کے عظیم حقائق کا عرفان پیدا کرنے میں کوشاں نظر آتی ہے۔ اس کا انشائیہ 'ڈیتھ آف دی موتھ' جو افسانوی انداز میں انشائیہ لکھنے کی کامیاب کوشش ہونے کے علاوہ انگریزی انشائیوں میں خیال انگیزی اور زندگی کی سفاکیوں اور بے رحم حقیقتوں کو پیش کرتا ہے۔

رابرٹ لنڈ اور چسٹرٹن پامال حقیقتوں سے انحراف کرکے نئی سچائیوں کی دریافت میں اپنی ذات کو اس درجہ شامل کرتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں انشائیہ میں ندرتِ خیال اور اظہارِ ذات کی ضرورت واضح ہوجاتی ہے۔

انشائیے کا یہی فن بیشتر ایسّے نگاروں کے ہاں نمو پزیر ہوا، خصوصاً جنھوں نے Familiar ایسّے لکھے۔ Personal Essay کو بعض ناقدین نے Essay کا ایک مخصوص رجحان قرار دیا اور اسے Essay کی روایت سے الگ کرکے دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں انگریزی میں اس رجحان پر عروج وزوال کے مرحلے آتے رہے۔ اس قبیل کی تحریروں کے خاتمے کا بھی اعلان کیا گیا لیکن ماندگی کے وقفے کے بعد اس رنگ کے دیکھنے والے دوبارہ تخلیقی توانائی کے ذریعے اس صنف کا اثبات کرواتے رہے۔ ایسّے کا یہی رنگ دراصل اس صنف کی ادبی حیثیت اور تخلیقی صنف ہونے کی ضمانت ہے کہ ان تحریروں میں Essay کو دفترِ معلومات کی تکنیکی حیثیت سے نجات دلوا کر ادب کی چیز بنادیا۔ یہی وصفِ خاص انگریزی کے بڑے انشائیہ نگاروں کے ہاں نظر آتا ہے۔ ان کی تحریریں انشائیہ کی ان ہی نزاکتوں اور فنی رموز کا احاطہ کرتی ہیں۔

جب بھی Essay کا نام آتا ہے ان ادیبوں کی تخلیقات ہمارے ذہن میں اس صنف کے بنیادی محاسن اور خدوخال اجاگر کردیتی ہیں۔ اردو انشائیہ نے بھی انگریزی انشائیہ کے متنوع اسالیب ورجحانات سے اکتسابِ نور کیا اور اس کے نت نئے انداز کو تخلیقی سطح پر بحسن وخوبی برتا۔ ابتدائی دور، خاص طور پر انیسویں صدی میں سماجی تحریکوں اور اصلاحی نقطۂ نظر کو جن ہنگامہ خیزیوں نے راہ دی تھی اس کے زیرِ اثر اس رنگ کی نمائندگی کرنے والے مغربی انشائیہ نگاروں کو ہمارے ادیبوں نے نظر کے سامنے رکھا۔

بیسویں صدی میں جب ٹھہراؤ اور سکون کی فضا قائم ہوئی تو اردو ایسّے نگاروں کے ہاں بھی غور وفکر کا رواج عام ہوا۔ Familiar ایسّے میں پائے جانے والے تفکّر اور آزادانہ سوچ سے ہمارے انشائیے مزّین ہوئے۔ اس طرح اردو انشائیہ نگاری میں ایک نیا رنگ وآہنگ تخلیقی سطح پر نمودار ہوا۔

حواشی

۱ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ مقدمہ ارسطو سے ایلیٹ تک۔ دہلی، 1977، ص33

۲ Houston Peterson, Great Essays, page 15, London, 1960۔

۳ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی۔ دیباچہ: اردو ایسیز، ص9۔

۴ ماتین۔ بحوالہ 'انشائیہ اردو ادب میں'، انور سدید، لاہور، 1985، ص116۔

۵ موتین۔ ترجمہ: انور سدید، مطبوعہ، اوراق، لاہور، انشائیہ نمبر، اپریل-مئی 1985، ص300۔

۶ بحوالہ، انشائیہ کی بنیاد، ڈاکٹر سلیم اختر' 1986، ص31۔

۷ محمد احسن فاروقی، انشائیہ مشمولہ: نیادور، کراچی، شمارہ 36-35، ص90

۸ بیکن، On Garden بحوالہ: اردو انشائیہ، انور سدید، ص124۔

۹ بحوالہ، انشائیہ کی بنیاد، ڈاکٹر سلیم اختر، ص33۔

۱۰ کتابیں پڑھنا، سر فرانسس بیکن، ترجمہ: انور سدید، مطبوعہ، اوراق، لاہور، انشائیہ نمبر اپریل مئی 1985، ص289۔

۱۱ غلام جیلانی اصغر، انشائیہ کیا ہے؟ ادبی ادنیا، شمارہ 9، ص254۔

۱۲ Mile Legouis, A short History of English Literature, London, 1956, Page 191.

۱۳ Hudson, An Introduction to the study of Literature, 1958, London, Page 53.

۱۴ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، لاہور، 1986، ص46۔

۱۵ George Sampson, Concise Cambridge History of English Literature, 1959, page 531.

۱۶ رات اور چاندنی، ترجمہ، سلیم آغا قزلباش، مغرب کے انشائیے، لاہور، 1989، ص110۔

۱۷ انشائیہ اردو ادب میں۔ انور سدید، 1985، لاہور، ص136۔

۱۸ اے جی گارڈنر، اظہارِ تشکر کرنا، مترجم: ممتاز احمد خان، اوراق، انشائیہ نمبر، مئی 1985۔

۱۹ ایلفا آف دی پلو، دوبارہ زندہ ہونے کی خواہش، ترجمہ: انور سدید، مطبوعہ، اوراق، لاہور، انشائیہ نمبر، اپریل-مئی 1985، ص249۔

۲۰ نوجوان نہ رہنے کے مزے، جی۔ کے۔ چسٹرٹن، ترجمہ: سلیم آغا قزلباش، مطبوعہ اوراق، لاہور، انشائیہ نمبر، اپریل-مئی 1985، ص309۔

۲۱ الوداع کہنا، میکس بیر بوم، ترجمہ ممتاز احمد خاں، ماہنامہ اوراق لاہور، انشائیہ نمبر مئی 1985، ص312۔

۲۲ کچھ عادت کے متعلق، رابرٹ لنڈ، ترجمہ: خالد صدیقی، ماہنامہ اوراق، انشائیہ نمبر، مئی 1985۔

۲۳ چاکلیٹ بس، رابرٹ لِنڈ، ترجمہ: انور سدید، مطبوعہ، اوراق، لاہور، انشائیہ نمبر، اپریل-مئی 1985، ص305۔

۲۴ موت ایک پتنگے کی، ورجینیا وولف، ترجمہ: انور سدید: مطبوعہ ماہنامہ اوراق، لاہور، انشائیہ نمبر، اپریل-مئی 1985، ص304۔

۲۵ American Essay, Page 12. بحوالہ: انشائیہ اردو ادب میں، انور سدید، لاہور، 1985، ص144۔

محمد اسد اللہ

30، گلستان کالونی، نزد پانڈے، امرائی لانس، جعفر نگر، ناگپور-440013

E-mail: zarnigar2005@yahoo.com

◆◆

اردو ہندی ڈکشنری

انجمن ترقی اردو (ہند)

قیمت: 300 روپے

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری

مولوی عبدالحق

قیمت: 500 روپے

تحقیقی مباحث

رؤف پاریکھ

قیمت: 300 روپے

طنزیہ و مزاحیہ

اندھا بانٹے ریوڑیاں...

مختار ٹونکی

ابتدائی اظہاریہ اور کلماتِ افتتاحیہ کے طور پر معلوم ہو کہ گئے گزرے زمانے اور قرنہا قرن پہلے کی بات نہیں ابھی کل پرسوں یعنی ہمارے بچپن لڑکپن کی بات ہے کہ ہر جمعہ جمعرات کو اکثر دکاندار و دیندار حضرات سبھی اطفال کو چنے بھونگڑے اور ریوڑیاں بانٹا کرتے تھے تاکہ نیکی جگ ظاہر ہوجائے اور بچوں کی کچھ پیٹ پوجا ہوجائے مگر وہ زمانے لد گئے اور سبھی پرانے مرکھپ گئے، اور صاحبو!:

وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

آج کل تو اندھا بانٹے ریوڑیاں اپنے اپنوں کو دے، کا دور دورہ ہے اور اسی کے دم کا دمدار ظہورا ہے۔ ویسے تو بندر بانٹ بھی بدنامِ زمانہ ہے مگر ہمیں تو مذکورہ ضرب المثل کو ہدفِ ملامت بنانا ہے:

1. سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس کندۂ ناتراش کی دونوں آنکھوں کے بلب فیوز تھے اور جو آنکھ سے اندھا نام نین سکھ کے مصداق تھا وہ ریوڑیاں کیوں بانٹ رہا تھا اور اس اندھے کو کس سوجھتے نے یہ حق دیا تھا کہ وہ لبِ سڑک کھڑا ہو کر ریوڑیاں بانٹنے کا اول جلول بلکہ فضول فریضہ انجام دے۔
2. سوال پیدا ہوتا ہے کہ گلی محلے اور شہر بھر میں اور کوئی دانا و بینا نہیں تھا جو اسے یہ بھاری بھرکم ڈیوٹی سونپی گئی تھی کہ وہ اپنی من مرضی سے ریوڑیوں کا تیا پانچہ کردے۔

منجملہ دیگر خوبیوں کے ہمارے پیارے پُرکھوں میں ایک پیاری خوبی یہ تھی کہ وہ فرصت و فراغت کے اوقات میں عجیب و غریب محاورے بناتے تھے اور بے تکی و بے ترتیب کہاوتیں ترتیب دیا کرتے تھے۔ حاشا و کلاّ ایسی ایسی نادرالوجود ضرب الامثال اور عدیم المثال اقوال وہ چھوڑ گئے ہیں کہ اگر آج بھی تجربات کی کٹھالی میں تپاؤ تو کندن نظر آتے ہیں

3. سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ آنکھوں سے اندھا تھا اور اپنے پرائے کی شناخت و پہچان سے عاجز و قاصر تھا تو اپنے اپنوں کو وہ کس طرح گڑ یا شکر کی ریوڑیاں بانٹ رہا تھا کہ وہ بہ آوازِ بلند پکار پکار کر اپنے عزیزوں چہیتوں کو متوجہ کر رہا تھا کہ آؤ میرے اپنوں آؤ اور ریوڑیاں لے جاؤ۔ آواز کے بل بوتے پر وہ یہ تماشا کر رہا تھا کہ یگانوں کو فائدہ پہنچا رہا تھا۔
4. سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس کہاوت کو گھڑنے والا کوئی بینا تھا کہ نابینا اور پھر طرفہ ریوڑی ظریفی یہ کہ اس نے ایسی اوٹ پٹانگ ضرب المثل بے بدل بنائی ہی کیوں؟

مگر— یہ تو بہرحال تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے پُرکھے جو برسوں قرنوں پہلے مرکھپ گئے اور منوں مٹی کے نیچے دب دبا کر خود بھی خیر سے مٹی ہوگئے۔ واللہ وہ ہمیں اکثر یوں یاد آتے ہیں کہ:

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والوں میں

منجملہ دیگر خوبیوں کے ہمارے پیارے پُرکھوں میں ایک پیاری خوبی یہ تھی کہ وہ فرصت و فراغت کے اوقات میں عجیب و غریب محاورے بناتے تھے اور بے تکی و بے ترتیب کہاوتیں ترتیب دیا کرتے تھے۔ حاشا و کلاّ ایسی ایسی نادرالوجود ضرب الامثال اور عدیم المثال اقوال وہ چھوڑ گئے ہیں کہ اگر آج بھی تجربات کی کٹھالی میں تپاؤ تو کندن نظر آتے ہیں اور قدم قدم آزماؤ تو سنگِ میل جاتے ہیں۔ سیکڑوں کہاوتیں ہیں، سنو تو سر دھنو اور پڑھو تو گنو۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ ہمارے قدمانے یہ خالص ادبی، لسانی، تہذیبی، ثقافتی خدمت بلا امتیازِ قوم و قبیلہ اور خطہ و صوبہ انجام دی ہے۔ ایران ہو کہ انگلستان اور ہندستان ہو کہ جاپان ہر زبان میں کہاوتوں کی بھرمار ملے گی۔ مثلاً

— اونٹ کے منہ میں زیرہ
— بندر کیا جانے ادرک کا سواد
— زبردست کا ٹھینگا سر پر
— جس کی لاٹھی اس کی بھینس
— سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے
— اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا
— سانپ کے منہ میں چھچھوندر...وغیرہ۔

کہاوتوں کے اندرون میں داخل ہوں اور ان کے چوباروں، بھول بھلیوں سے گزریں تو ان کے مطالب و مفاہیم کی نیرنگی آپ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کس سے ہے رشتہ جوڑا۔ صاحبو! ویسے تو ہر کہاوت میں طویلے کی بندر کے سر ہے، مگر بندر ادرک کا استعمال کرے گا تبھی تو لطف و لذت سے ہمکنار ہوگا۔ 'اندھے' مہودے کی کہاوت بنانے والے کو داد دینی ہوگی کہ اس نے مستقبل بعید میں جھانک کر معلوم کرلیا تھا کہ ایک زمانہ بیسویں اکیسویں صدی میں ایسا آئے گا کہ انعام و اعزاز کی ریوڑیاں بانٹنے کا کام کور چشموں کو سونپا جائے گا اور اس کا بیّن ثبوت ہماری ذات ہیچ صفات ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے اور ہمارا منہ نہ کھلوائے، ہمیں اردو شعر و ادب کا بھاڑ جھونکتے جھونکتے اور محترمہ برج بانو کی خدمات کے پاپڑ بیلتے بیلتے نصف صدی بخیر و خوبی گزر گئی مگر پھر بھی حسبِ دل خواہ کہیں سے بھی از راہِ خواہ مخواہ صلہ و ستائش کی ریوڑی نہ پائی مگر نالائقوں کے ریوڑ نے جگہ پائی۔ ادارے انجمنیں جو انعامات و اعزازات کی کھاٹ کھڑی کرتی ہیں وہ ہمیں پہچانتی نہیں اور نام نہاد ادبی سوسائٹیاں اور ستم ایجاد اکادمیاں جو شعرا و ادبا کو ہر سال شال دو شالے اڑھا کر نہال کرتی ہیں، ہمیں بالکل بھی گردانتی نہیں کہ ہم کس کھیت کی گاجر مولی ہیں۔ کہیں اقربا پروری ہے تو کہیں احباب نوازی ہے۔ اِدھر صوبائی عصبیت ہے تو اُدھر گروپ بندی کی لعنت ہے۔ جائیں تو جائیں کہاں۔ سمجھے گا کون یہاں درد بھرے دل کی زبان۔ کبھی کبھار ہم سوچتے ہیں کہ یہ تو ریوڑیوں کی بات ہے اگر اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ جائے تو کیا ہوگا۔ ارے بھئی! وہی ہوگا جو اندھیر نگری چوپٹ راج میں ہوا کرتا تھا۔ مختار کرو جگاڑ:

آخر بہ قدرِ ظرف پذیرائیاں تو ہیں

مختار ٹونکی
کالی پلٹن روڈ، پل محمد خاں، ٹونک-300401 (راجستھان)
Mob. 9214826684

مدیر : **اطہر فاروقی**
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-٦
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***